ایک چراغ اور بجھا اور بڑھی تاریکی.....!

مولانا محمد ازہر

[ملک کی معروف علمی محقق ودانشور ڈاکٹر محمود احمد غازی کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے، ان کا مختصر تعارف نذر قارئین ہے۔ادارہ]

قحط الرجال کے موجودہ افسوس ناک دور میں جب کوئی ایسی ہستی جدا ہوتی ہے جس کا وجود مسائل وافکار سے پریشان رہنمائی کی متلاشی امت کے لیے مینارہ نور کی حیثیت رکھتا ہے تو صدمہ اور غم دوچند ہو جاتا ہے، اس لیے کہ اب دور دور تک ایسی شخصیات نظر نہیں آتیں جن کا اوڑھنا بچھونا علم ہو، جن کا تعارف قرآن وحدیث، فقہ اور علوم وفنون شرعیہ پر گہری دسترس ہو۔

معروف محقق ودانشور، مصنف وادیب، صاحب علم وفضل ڈاکٹر محمود احمد غازی کا شمار بھی ان اہل علم میں ہوتا تھا جن کی اہلیت وقابلیت اور دینی ثقاہت پر قدیم وجدید علماء کا اتفاق تھا اور عصری درس گاہوں سے وابستگی کے باوجود دینی مدارس کے اساتذہ وطلبہ بھی ان کی تصنیفات وتالیفات سے استفادہ کرتے نظر آتے تھے۔افسوس کہ ڈاکٹر محمود احمد غازی بھی 14 شوال 1431ھ (21 ستمبر 2010ء) کو علمی وتدریسی حلقوں کو سوگوار چھوڑ کر خالق حقیقی سے جا ملے۔إنا لله وإنا إليه راجعون

ڈاکٹر صاحب کا خاندانی تعلق ٹھیٹھ مذہبی گھرانے سے تھا، داعی کبیر حضرت مولانا الیاسؒ اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ ڈاکٹر صاحب کی والدہ کے سگے پھوپھا تھے۔آپ کے والد محمد احمد متدین اور متبع سنت بزرگ تھے جنہوں نے ڈاکٹر صاحب کی دینی تعلیم وتربیت کا خاص اہتمام کیا۔ڈاکٹر صاحب نے درس نظامی کی ابتدائی تعلیم جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی سے حاصل کی، جب کہ دینی علوم کی تکمیل شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خانؒ کے مدرسہ تعلیم القرآن راجہ بازار راولپنڈی میں کی اور مولانا ہی سے تفسیر قرآن پڑھی، قرآن کریم کے پختہ حافظ تھے، ہر سال رمضان المبارک میں قرآن کریم سنانے کا معمول تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے سترہ سال کی عمر میں تدریس کا آغاز کیا اور تادم آخر اس فریضہ کو نبھاتے رہے، اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنی تعلیمی سفر کو جاری رکھا اور پوسٹ گریجویٹ اور ڈاکٹریٹ کی ڈگریوں کی تحصیل کے بعد تصنیف وتالیف ،تحقیق وتدقیق کے میدان میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔قدیم وجدید علوم پر دسترس اور خداداد غیر معمولی صفات و کمالات کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب مرحوم اپنی زندگی میں بہت ہی اہم ذمہ داریوں پر فائز رہے۔استاذ سے لے کر وزارت تک بہت سے مناصب پر آپ کی صلاحیتیں نمایاں ہوئیں۔حق تعالیٰ شانہ نے آپ کو تحریر وتقریر کا خاص ملکہ عطا فرمایا تھا، عربی، فارسی، فرانسیسی، انگریزی اور اردو زبان کے بہترین خطیب وادیب تھے ہفت زبان ہونے کا محاورہ ڈاکٹر صاحب کے لیے مجازاً نہیں، حقیقتاً استعمال ہوتا تھا۔سرکاری مناصب پر فائز ہونے کے باوجود ڈاکٹر صاحب قومی، ملی اور دینی تحریکوں کے پشت پناہ رہے۔قادیانی تحریک کے خلاف مسلمانوں کے متفقہ مؤقف کی ترویج واشاعت کے لیے آپ نے گرانقدر خدمات انجام دیں اور جنوبی افریقہ کی ایک عدالت میں قادیانیوں کے مقابلے میں امت مسلمہ کا مؤقف پیش کرنے کی سعادت ڈاکٹر صاحب کو عطا کی گئی۔

جامعہ خیر المدارس ملتان نے جب عصری تقاضوں کے پیش نظر ''خیر المعارف'' کے نام سے ایک جدید درس گاہ قائم کی تو اس کے رسمی افتتاح کے لیے جامعہ کے مہتمم مولانا قاری محمد حنیف جالندھری نے ڈاکٹر صاحب کو دعوت دی، ڈاکٹر صاحب ان دنوں (2000ء) مذہبی امور کے وزیر تھے۔افتتاح کے موقع پر انہوں نے دینی علوم کی عظمت واہمیت پر فاضلانہ خطاب فرمایا، اس کے ساتھ ساتھ ایسے اہل علم کی ضرورت پر زور دیا جو دورِ جدید کے رجحانات پر ناقدانہ نظر رکھتے ہوں۔''کتاب الآراء'' میں اپنے تأثرات رقم کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے لکھا:

> ''ادارہ خیر المعارف، پاکستان میں دینی تعلیم کے میدان ایک منفرد اور انقلابی تجربہ ہے۔اس ادارے کا مقصد ایسے علمائے دین تیار کرنا ہے جو ایک طرف سلف صالحین کے تقویٰ وللّٰہیت والی صفت کے مظہر ہوں اور دوسری طرف جدید دور کے تقاضوں اور فکری رجحانات سے براہ راست اور ناقدانہ واقفیت رکھتے ہوں، مجھے امید ہے کہ ''ادارہ خیر المعارف'' اپنے پاک نفس، پاکباز مدرسین کی اعلیٰ دینی روایات کو بلند سے بلندتر کرنے کے ساتھ ساتھ اس دور میں دینی قیادت فراہم کر سکے اور دورِ جدید کے رجحانات پر ناقدانہ نظر رکھنے والے اہل علم پیدا کرے گا''۔

حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا شمار امت کے ان نادیدہ اور ناپید افراد میں ہوتا تھا جو ان کے بقول دورِ جدید کے رجحانات پر ناقدانہ نظر رکھتے تھے اور امت کو دینی قیادت فراہم کر سکتے تھے۔

راقم الحروف کو دو چار مرتبہ ڈاکٹر صاحب کی مجلس میں بیٹھنے کی اور کسی حد تک استفادہ کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔غیر معمولی علمی مقام کے باوجود ان کے عجز وانکسار،، سادگی ونرم مزاجی اور دھیمے پن نے احقر کو بہت متاثر کیا۔ڈاکٹر

صاحب کی گفتگو، سلاست، بلاغت، متانت اور فقاہت کا مرقع ہوتی تھی۔

ایک مرتبہ جامعۃ الرشید احسن آباد کراچی میں ایک مجلس میں موضوع گفتگو مسلمانوں کی علمی، عملی اور معاشی زبوں حالی اور صورت حال کی تبدیلی، امکانات اور تجاویز تھا۔ اس مجلس میں بھی ڈاکٹر صاحب کی گفتگو نہایت پُر مغز، معلومات افزا اور فاضلانہ تھی۔ مسلمانوں میں پائے جانے والی ایک غلط فہمی کی اصلاح کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے فرمایا:

''ہمارے ہاں بہت سے حضرات سادہ لوحی سے مغرب کا مطالعہ کرتے ہیں اور مغرب کے ظاہری دعووں سے متاثر ہو جاتے ہیں، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مغرب نے مذہب کو گھر سے نکال دیا ہے اور اب مغرب مذہبی تعصب سے آزاد ہو گیا ہے، جب کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ مغرب کی ہر چیز عیسائی تہذیب وتمدن، عیسائی روایات اور عیسائی تعصبات پر مبنی ہے۔ یہ بات خود مغربی مصنفین نے بھی کہی ہے لہٰذا عیسائیت کو مغرب سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ سمجھنا کہ مغربی دنیا سیکولر ہے، اس لیے اسے مذہبی مفادات سے کوئی دلچسپی نہیں اور وہ مذہبی عصبیت سے بالاتر ہے، سادہ لوحی بلکہ بے وقوفی ہے۔

اپنی بات کو مدلل کرنے کے لیے ڈاکٹر صاحب نے اپنا ایک ذاتی تجربہ بیان کیا جس سے مسلمانوں کے بارے میں اہل مغرب کی عصبیت کا اندازہ ہوتا ہے، انہوں نے بتایا کہ جرمنی میں ایک اعلیٰ سطحی کانفرنس ہوئی، جس میں دنیا بھر کے دانشوروں کو مدعو کیا گیا تھا، اس میں عیسائی مندوبین کی تعداد 60 تھی جب کہ عالم اسلام کی نمائندگی کرنے والے مسلمان صرف تین تھے۔

سامعین، جرمنی کے صف اول کے لوگ تھے۔ اس کانفرنس میں مجھے جس موضوع پر خطاب کا موقع ملا، وہ تھا ''یورپ کی ٹیکنالوجی سے مسلمانوں کا رویہ کیا ہونا چاہیے'' اس پر میں نے عرض کیا کہ جب انگریز برصغیر میں آئے تو ان کی تہذیب ومعاشرت، کلچر، روایات اور ٹیکنالوجی کے بارے میں تین قسم کے نظریات اور رویے سامنے آئے، بعض لوگ وہ تھے جنہوں نے مغرب کی ہر چیز کو خطرہ سمجھا اور تہذیب ومعاشرت سے لے کر ٹیکنالوجی تک مغرب سے درآمد شدہ ہر چیز کا مکمل مقاطعہ یا بائیکاٹ کر دیا۔ ایسے افراد کی تعداد بہت کم تھی اور یہ نظریہ بعد ازاں ختم ہو گیا، اب اس نظریہ کے لوگ نہیں پائے جاتے۔ دوسرا نقطہ نظر ان لوگوں کا یہ تھا جنہوں نے بلا استثناء انگریزوں کی ہر چیز قبول کرنے کا نظریہ پیش کیا، یہ نظریہ ابھی تک چل رہا ہے لیکن سو سال میں اس کا نتیجہ مسلمانوں کی ملی وتہذیبی تباہی کے سوا کچھ نہیں نکلا۔ تیسرا رویہ اور نقطہ نظر یہ تھا کہ مغرب سے خیر کی چیزیں لے لی جائیں اور شر کی چیزیں چھوڑ دی جائیں، جسے عربی میں '' خذ ما صفا و دع ما کدر '' کہا جاتا ہے۔

یہ ایک معقول ومعتدل نظریہ ہے اور مسلمانوں کو اسے اختیار کرنا چاہیے، مگر میری حیرت کی انتہاء نہ رہی جب میرے خطاب کے بعد جرمنی کے ایک سامع نے کہا کہ یہ آپ کا خیال ہے کہ آپ مغرب کی اچھی چیزوں سے استفادہ کریں اور جو آپ کی نظر میں اچھی نہ ہوں انہیں چھوڑ دیں۔ مغرب سے استفادے کے لیے آپ کو مغرب کی تمام شرائط ماننا ہوں گی۔ مثال کے طور پر آپ مغرب کی ایجادات سے فائدہ اٹھاتے ہیں تو آپ کو سیکولر بیوکریسی اور مساواتِ مرد وزن کا فلسفہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا۔ مجھے خیال ہوا کہ شاید اس شخص کے ذاتی خیالات ہوں اور یہ شخص مسلمانوں کے خلاف متشددنظریہ رکھتا ہو۔ لیکن جب مجھے دوسرے مقامات پر جانے، لوگوں سے ملنے، ان کے نظریات معلوم کرنے اور ان کی کتابیں پڑھنے کا اتفاق ہوا تو معلوم ہوا کہ اس مسئلہ میں پورا مغرب یک زبان ہے اور وہ مسلمانوں کو ان کے عقیدے اور دین کے مطابق زندگی گزارنے کا حق دینے کے لیے تیار نہیں"۔

اس گفتگو سے شرکائے مجلس کو اندازہ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب مغربی افکار ونظریات پر نقد ومحاکمہ کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس موضوع پر آپ کی کتاب "اسلام اور مغرب کے تعلقات" اردو خواں حضرات کے لیے لائقِ مطالعہ ہے۔

آج ڈاکٹر صاحب ہم میں نہیں رہے۔ اسکول اور کالج کے طلبہ کو تو کجا شاید دینی مدارس کے طلبہ کو بھی اس نقصان اور خلا کا اندازہ نہ ہو سکے جو ڈاکٹر محمود احمد غازی کی وفات سے ہوا ہے ؎

جواب اس بات کا یارانِ محفل سوچنا ہوگا ہمارے بعد ہم جیسے لوگ کہاں سے لاؤ گے

حق تعالیٰ شانہ ڈاکٹر صاحب مرحوم ومغفور کی کروٹ کروٹ مغفرت فرمائیں۔ آمین

فقیہ کی تعریف

فرمایا کہ محض فقہی کتابوں کے جزئیات یاد کر لینے سے انسان فقیہ یا مفتی نہیں بنتا، میں نے ایسے بہت سے حضرات دیکھے ہیں جنہیں فقہی جزئیات ہی نہیں ان کی عبارتیں بھی ازبر تھیں، لیکن ان میں فتویٰ کی مناسبت نظر نہیں آئی، وجہ یہ ہے کہ درحقیقت فقہ کے معنی "سمجھ" کے ہیں، فقہی وہ شخص ہے جسے اللہ تعالیٰ نے دین کی سمجھ عطا فرمادی ہو اور یہ سمجھ محض وسعت مطالعہ یا فقہی جزئیات یاد کر لینے سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ اس کے لیے کسی ماہر فقیہ کی صحبت اور اس سے تربیت لینے کی ضرورت ہے۔ (مجالس مفتی اعظمؒ: ۶۲۴)